© rasailojaraid.com

کیوں اسے انگشت نمائے خلق کرنے کی غرض سے اس کی لاش میں بھس نہ بھرا اور اسے گشت نہ کرایا۔ مگر ہمارے قاری کو اس طرح کی سزا کا کوئی ذکر کتب تاریخ میں نہ ملے گا اور سلطان کے ردعمل اور عمل سے اسے تعجب انگیز مایوسی ہوگی، کیونکہ اس موقع پر جس طرز عمل کا اس نے اظہار کیا وہ اس کے کردار سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان جلال الدین فیروز خلجی یا سلطان فیروز شاہ کی جمالی کیفیت سلطان محمد بن تغلق کے جلال پر غالب آ گئی ہے اور گرگ خوں آشام بچۂ برہ کے حضور دم ہلا رہا ہے۔

سلطان نے وزیر سے عباسی کی برہمی کا سنتے ہی دس (۱۰) عمائد کے ہمراہ جن میں امیر کبیر ملک قبولہ بھی تھا، قصر سلطان سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سیری میں عباسی کے محل کے دروازہ پر جا پہنچا۔ محل کے باہر عام آدمیوں کی طرح گھوڑے سے اترا، اندر آنے کی اجازت طلب کی اور اجازت ملنے پر محل میں عباسی کے پاس گیا۔ سلطان نے عباسی سے ''تقصیر'' کی معافی مانگی، خیر ردوکد کے بعد عباسی کی خفگی، رضامندی میں بدل گئی لیکن سلطان نے اصرار کیا کے جب تک ''مخدوم زادہ'' اپنا پاؤں میری گردن پر نہ رکھیں گے، مجھے یہ یقین نہ آئے گا کہ آنجناب نے مجھے معاف کر دیا ہے اور مجھ سے راضی ہو گئے ہیں۔ عباسی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر بڑے اصرار اور خوشامد کے بعد (پتا نہیں عباسی راضی ہوا یا اس کی مرضی کے خلاف زبردستی) امیر کبیر ملک قبولہ نے اس کا پاؤں اٹھا کر سلطان کی گردن پر رکھ دیا جو عباسی کے حضور سربسجود تھا۔ اس پر سلطان نے خوش ہو کر کہا کہ ''اب مجھے یہ یقین ہو گیا ہے آنجناب مجھ سے راضی ہو گئے ہیں اور مجھے معاف کر دیا ہے''۔ ابن بطوطہ نے اس ڈرامہ کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ میں نے کسی کو اس طرح کی (چھچھوری) حرکت کرتے نہ دیکھا، نہ سنا ہے۔ اس سارے واقعہ پر کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے مدون نے یہ پھبتی کسی ہے کہ ''ایک اونچے خاندان کے گداگر کے حق میں سلطان کی یہ فضول خرچی اور غلط بخشی ایسی ہی ہے کہ اسے عقل سلیم و ہوش و خرد سے کسی طرح کی مطابقت نہیں دی جاسکتی'' [۱۴]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصر کے عباسی خلفاء کی تعظیم وتکریم اور خاندان عباسی کے ایک فرد کی اس عزت افزائی کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنے کے بعد ہم مصر میں ''ممالیک'' کی نگرانی بلکہ ''تولیت'' میں قائم ہونے والی نام نہاد ''خلافت'' کے احوال وآثار کا ایک اجمالی تعارف کرائیں گے، تاکہ ''سلطان الہند'' کی ان کی قدم بوسی وتکریم کو صحیح تناظر میں دیکھا جاسکے۔

بنو عباس کی ''خلافت'' ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں قائم ہوئی اور ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) تک سوا پانچ سو سال قوت وضعف کے مختلف مراحل سے گزر کر چنگیز خاں کے پوتے ہولاکو خاں کے ہلاکت بداماں منگولی غول بیابانی کے ہاتھوں شکست وریخت کا شکار ہو کر گرد وغبار کی طرح طوفان آتش وخون کی بھینٹ چڑھ گئی۔

خلافت عباسیہ کی اس طویل ترین مدتِ حکومت سے، کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان کے سینتیس (۳۷) خلفاء جو یکے بعد دیگرے مسندِ نشین خلافت ہوئے، ہمہ مقتدر تھے، اعلیٰ عسکری وانتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے اور انھوں نے کشور کشائی کی تاریخ میں لافانی نقوش بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اقتدار واقعی کا زمانہ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) سے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) تک ہے اور اس مدت میں وہ بااختیار اور امر و ناہی تھے۔ اس دور میں دس (۱۰) خلفاء اورنگ آرائے حکومت ہوئے اور ان میں بھی اعلیٰ حربی وانتظامی صلاحیتوں کے حامل صرف پانچ خلفاء تھے یعنی المنصور، المہدی، الہارون، المامون اور المعتصم باللہ۔ المتوکل کے ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) میں قتل کے بعد اگرچہ خلافتِ عباسیہ چار سو سال کے قریب قائم رہی اور ان کے ستائیس (۲۷) مدعیانِ خلافت بساط سیاست پر شاہ شطرنج کی طرح نمودار ہوئے اور پٹتے رہے، ان کی حیثیت مہروں سے زیادہ نہ تھی، کبھی ترک غلاموں کی سرکشی کے سامنے وہ بے دست و پا تھے، کبھی بویہی امراء کے اسیر تھے، کبھی سلاجقہ، بزرگ کے مہرے اور کبھی خوارزم شاہیہ کی ہیبت سے لرزہ براندام رہے۔ ھولاکو نے ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں جس عباسی خلافت کو تہس نہس کیا وہ مسندِ مشیخت سے زیادہ نہ تھی۔ اور جس خلیفہ کی خلافت کا انھوں نے خاتمہ کیا اور اسے ہلاک کیا وہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خانقاہ کے پیر بوریا نشین کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ایک ایسی خلافت جیسی کہ بنو عباس کی تھی، جس کی عمر ایک سو سال سے کچھ ہی اوپر تھی، حیرت ہے کہ وہ بے اقتداری، بے صلاحیتی اور بے بسی کی اعصاب شکن کیفیات میں کس طرح مزید چار سو سال تک کڑیاں جھیلتی رہی اور اس عہد کے کسی مسلمان سلطان نے جن میں عضد الدولہ بویہی، سیف الدولہ حمدان، محمود غزنوی، طغرل سلجوقی، الپ ارسلان سلجوقی، اور ملک شاہ سلجوقی جیسے عظیم کشور کشا اور کشور آرا موجود تھے اس کے برائے نام وجود کو نہ مٹا سکے، اس کے آستانۂ خلافت پر قبضہ نہ کر سکے اور اسی بے اختیار خلافت سے پروانۂ حکومت، سند حاکمیت اور لوائے امتیاز حاصل کرتے رہے۔ یہ قیاس کرنا محض خوش فہمی نہیں ہے کہ اگر کافر ہولاگو کے کافر منگول خوں خوار بھیڑیئے بغداد پر ٹوٹ نہ پڑتے، خاندان خلافت کو برباد نہ کر دیتے اور شہر امن وسلامتی (مدینۃ السلام) کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دیتے تو خلافت عباسی جیسا کہ داؤد علی بن عباسی نے کوفہ کے منبر سے اعلان کیا تھا، قائم رہتی اور قرب قیامت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جائزہ حکومت دیتی[15]

تاریخ کا طالب علم بے اقتداری اور انتشار کے باوجود خلافت عباسیہ کے طویل عرصہ تک استقرار و استمرار کا سبب جاننا چاہے گا۔ ہم سطور آیندہ میں اختصار کے ساتھ ان عوامل کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے بنو عباس کی خلافت باقی رہی اور کسی مسلمان فاتح نے اسے فتح کرنے کی ہمت نہ کی یہاں تک کہ ایک کافر، تہذیب وتمدن نے ناآشنا حکمران کی انسانیت دشمن گرگ صفت سپاہ نے اس برائے نام خلافت کا گلہ گھونٹ دیا۔ کاش وہ یہ سوچتے کہ انھوں نے ایک اسرۂ حاکمہ کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ تہذیب وثقافت کے مینارۂ نور کو ڈھا دیا، ایک کمزور خلیفہ کو ہلاک نہیں کیا بلکہ علم وآگہی، انسانیت وشرافت کے ایک نشان بلند کو زمین بوس کر دیا اور اسلام کے اتحاد کو میٹ دیا۔

دعوت عباسیہ (عباسی تحریک) بنیادی طور پر ایک شیعی مذہبی وسیاسی تحریک تھی۔ اہل تشیع کے فرقہ کیسانیہ سے اس کا تعلق تھا۔ تمام شیعی تحریکیں ''اہل بیت'' رسول ﷺ کی تقدیس کی قائل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، امامت وخلافت کو نبوت ورسالت کی طرح عطیہ الٰہی سمجھتی ہیں اور یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ امام وخلیفۂ منصوص من اللہ ہوتا ہے۔ جس کے نصب وعزل میں بندوں کا کسی طرح کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ وصی رسولؐ تھے اور رسول مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد وہی اہل ایمان کے امام برحق، اہل اسلام کے امیر اور رسول برحق علیہ السلام کے جانشین وخلیفۂ تھے۔ ان کے پیش رو آئمہ وخلفاء اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق غاصب ومتغلب تھے۔ ابتداءً امامت وخلافت کو حضرتِ علیؓ کی فاطمی اولاد امجاد میں محدود کیا گیا۔ مگر جب مختار ابن ابی عبید ثقفی نے ۶۶ھ میں کوفہ میں حکومت کے خلاف خروج کیا اور عراق کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا تو اس نے ''اہل بیت رسول'' کے سربرآوردہ فرد جناب علی بن حسین بن علی المعروف بہ زین العابدین کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن بوجوہ اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ چالاک مختار نے نظریۂ ضرورت کے تحت حضرت علیؓ کے غیر فاطمی بیٹے محمد ابن الحنفیہ سے رجوع کیا اور ان کی امامت کا اعلان کردیا۔ یوں امامت وخلافت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور تمام اولادِ علیؓ، فاطمیؓ اور غیر فاطمیؓ مستحق امامت وخلافت ٹھہری مختار ثقفی کے قائم کردہ اس شیعہ فرقہ کو مختاریہ، کیسانیہ اور ہاشمیہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا۔

محمد بن حنفیہ کے ۸۰ھ میں انتقال کے بعد فرقہ، کیسانیہ کی امامت ان کے بیٹے ابو ہاشم کے حصہ میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۹ھ میں دمشق سے لوٹتے وقت ابو ہاشم نے حمیمہ کے مقام پر جہاں بنو عباس کے کچھ خاندان سکونت رکھتے تھے، انتقال کیا اور اپنے بعد بنو عباس کے ایک شخص محمد بن علی بن عبداللہ عباس بن عبدالمطلب کو اپنا جانشین مقرر کردیا۔ یوں اہل بیت رسولؐ اور آل محمدؐ کی اصطلاح میں بنو عباس بھی داخل ہوگئے اور شیعی تحریکوں میں امامت بنو فاطمہؓ، آل علیؓ، اور آل عباسؓ، کے حامی شامل کرلئے گئے، حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ رسول اکرم علیہ السلام کے چچا تھے اور فتح مکہ سے کچھ ہی پہلے اسلام لائے تھے، اس لیے نہ ان کا شمار مہاجرین اولین میں تھا اور نہ انھیں قدیم الاسلام صحابہ کرام میں کوئی مقام دیا گیا۔ حضرت علیؓ السابقون الاولون میں تھے انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابتدائی اسلام لانے والوں اور ابتدائی ہجرت کرنے والوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان کی فدائیت، خدمت اسلام اور شرف مصاہرت (دامادی رسولؐ) نے انھیں صحابہ کرام میں نمایاں مقام عطا کیا تھا، وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے اور رسول اکرم علیہ السلام کے چوتھے جانشین اور خلیفۂ راشد تھے۔ ان کے اس شرف کے سبب اور ان کے دو بڑے صاحبزادوں جناب حسن و جناب حسینؓ کے فرزندانِ جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمہؓ ہونے کے سبب اولادِ علیؓ کو اسلامی اشرافیہ میں امتیازی مقام حاصل تھا، بنوعباس کو ان حضرات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی، اس لیے محمد بن علی بن عبداللہ کے منصب امامت پر فائز ہونے سے انھیں کوئی بڑا مقام نہ مل سکتا تھا۔ اس حقیقت کا محمد بن علی کو بخوبی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بنوعباس کے دعویٰ امامت کی کوئی عوامی پذیرائی نہ ہوگی، اس لیے فرقہ کیسانیہ، مختاریہ یا ہاشمیہ کے اس نئے امام محمد بن علی نے اپنی امامت کی دعوت دینے کی بجائے صرف امامت آل محمدؐ کا پروپگنڈا شروع کیا۔ خانوادۂ علویؓ کے افراد اور ان کے شیعہ اس تحریک سے وابستہ ہوگئے کیونکہ وہ آل محمدؐ کے مفہوم میں صرف حضرت علیؓ کی فاطمیؓ اولاد کو داخل سمجھتے تھے۔

یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بنوعباس در پردہ اپنی امامت کی راہ ہموار کررہے اور انھیں فریب دے رہے ہیں۔ جب یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور کوفہ میں ۱۳۲ھ میں ابوالعباس عبداللہ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کی بیعتِ خلافت وامامت ہوئی اور اس نے ''السفاح'' کے بارعب لقب سے اپنے خاندان کی خلافت کا آغاز کیا، تو آل علی حیران و ششدر ہوگئے اور اپنی ''سادگی'' اور حریف کی ''عیاری'' پر دل مسوس کررہ گئے۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور (۱۳۶ء تا ۱۵۸ھ) کے دور سے علویوں نے عباسیوں کے خلاف موقع بے موقع خروج کیا اور بنوامیہ سے زیادہ، بنوعباس کے عہد میں جور و ستم اور قتل و قید کے مظالم جھیلے۔ ان واقعات کی تفصیل میں جا کر ہم اپنے موضوع سے دور ہٹنا نہیں چاہتے، اس لیے ذکر کو یہیں ختم کردینا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایک طویل مضمون بعنوان ''علویوں اور عباسیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تعلقات پر ایک نظر'' میں اس بحث کو پھیلایا ہے۔ قاری کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیا جاتا ہے[۱۶]

جب ۱۰۰ھ میں محمد بن علی عباسی نے اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کیا اور خلافت اسلامیہ کے مشرقی علاقوں (خراسان و ماوراالنہر و سجستان) میں اپنے داعی بھیجے تو انھیں صرف ''آل محمدؐ'' کی امامت کی دعوت کی ہدایت کی اور بنو عباس کی دعوت، امامت و خلافت سے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، عمداً احتراز کیا۔ مگر جیسے ہی مشرقی صوبوں پر ابو مسلم خراسانی کا قبضہ ہو گیا اور عراق کے گورنر ابن ہبیرہ، کو شکست ہوئی اور وہ واسط میں قلعہ بند ہو گیا، تو اب اس اخفاء اور احتیاط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسی لیے جب کوفہ کی جامع مسجد سے ابو العباس عبداللہ بن محمد عباسی کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور لوگوں کو اس کی بیعت کی دعوت دی گئی تو ہر چند کے اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا، اس نے من جملہ دیگر امور سے اپنے خطبۂ خلافت میں یہ بھی کہا:۔

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمارے لیے اسلام کو پسند کیا۔ اور اسے ہم سے قوی دست کیا، ہمیں اس کی پناہ گاہ بنایا اور اپنے رسول کی قرابت داری کے شرف سے ہمیں مشرف کیا۔ ہمیں ان کے خاندان میں پیدا کیا اور اہل اسلام میں ہمیں بلند مرتبہ عطاء کیا اور ہماری مودّت ان پر فرض کی (اس کی دلیل کے بطور سفاح نے قرآن کی تین آیتیں سورۃ الاحزاب، آیت ۳۳، الشوریٰ، آیت ۲۳، الشعراء آیت ۲۱۴ پڑھیں) یہ گمراہ سبائی (شیعہ) یہ گمان فاسد رکھتے ہیں کہ امامت، ریاست اور سیاست کا ہم سے زیادہ حق دار کوئی اور ہے (اشارہ علویوں کی جانب تھا) حالانکہ ہماری بدولت لوگوں کو گمراہی کے بعد ہدایت ملی، باطل کا قلع قمع ہوا اور جو فساد در آیا تھا، اللہ نے ہمارے ذریعہ سے اس کی اصلاح کی اور اسے درست کیا''۔

ابو العباس السفاح بخار کی شدت کے سبب اس سے زیادہ نہ بول سکا اور منبر سے اتر آیا۔ اس کا چچا داؤد بن علی جو منبر پر اس سے ایک زینہ نیچے کھڑا تھا۔ اس نے اس کی ادھوری تقریر کو مکمل کیا۔ اس نے حاضرین سے یوں خطاب کیا:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے دشمن (بنوامیہ) کو ہلاک کر دیا اور ہمارے نبی ﷺ کی جو میراث تھی اسے ہم تک پہنچا دیا.......لوگو! اب ہمارے نبی کے ''اہل بیت'' کی جانب حق (خلافت) لوٹ آیا ہے.......اے اہلِ کوفہ! اللہ کی قسم ہم ایک عرصہ سے مظلوم تھے اور ہم سے ہمارا حق (خلافت و امامت) زبردستی چھین لیا گیا تھا...... جب خراسان سے ہمارے حامی (شیعان بنوعباس) آئے تو ہمارا حق زندہ اور بحال ہو، ہماری حجت برومند ہوئی ان لوگوں کی بدولت ہمیں اقتدار و غلبہ حاصل ہوا۔ ہمیں جس کا انتظار تھا وہ ظاہر و باہر ہو گیا اور اللہ نے اسے کر دکھایا.......مقام شکر ہے کہ اللہ نے بنو ہاشم کو منصب خلافت پر فائز کیا اور ہم سرخرو ہوئے...... لوگو! جناب رسول ﷺ کے بعد جو لوگ بر سر منبر آئے ان میں حضرت علیؓ اور (السفاح کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس امام و خلیفہ کے سوا کوئی برسرِ حق اور جائز امام و خلیفہ نہ تھا.......لوگو! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ امر (یعنی امامت و خلافت) اب ہمارے خاندان سے باہر نہ جائے گا اور ہم قیامت کے قریب حضرت عیسیٰؑ کو اس کا جائزہ دیں گے'' [۱۷]

السفاح کے مذکورۂ بالا خطبہ اور داؤد بن علی کے تکملہ سے جن عقاید کا پتا چلتا ہے وہ خالص شیعی ہیں۔ ان دونوں نے یہ بات بڑے دھڑلے سے دہرائی ہے کہ امامت و خلافت آل عباس کا حق ہے اور اسلام کے پہلے تین خلفاء راشدون غاصب و متغلب تھے۔ اس خطبہ اور اس کی تکملہ میں ''اہل بیت'' کے اسلام اور اہل اسلام پر احسان کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور آیات قرآنی کی رو سے ان کی محبت و مودت کو مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں چچا بھتیجے نے اپنی مظلومیت کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن تاریخ نے عہد خلفاء راشدون اور عہد اموی میں ان پر کسی ظلم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسند خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بنو عباس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اور ان کے بزرگوں نے خلفاء راشدون اور تمام اموی خلفاء کی بیعت خلافت کی تھی اور خلافت کو میراث رسول قرار دیکر اس پر انھوں نے کسی طرح کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس خطبہ اور اس کی تکملہ کی رو سے امامت و خلافت میراث رسول تھی اور چونکہ رسول اکرم ﷺ کے وصال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے وقت آپؐ کے واحد زندہ چچا عباسیوں کے جد اعلیٰ جناب عباسؓ آپ کے وارث تھے اس لیے یہ میراث انھیں ملی اوران سے اولادِ عباس کو وراثۃً یہ منصب منتقل ہوا۔ حضرت علیؓ چونکہ آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی تھے اس لیے چچا کے ہوتے انھیں میراث نہیں مل سکتی تھی۔ مزید یہ کہ حضرت فاطمہؓ بیٹی تھیں اور بیٹی ''عصبہ'' نہیں ہوتی اس لیے وہ بھی اس میراث کی حق دار نہ تھیں اور حضرت حسن و حسین بیٹی کی اولاد ہونے کے ناطے، میراث نبوی کے وارث نہیں ہو سکتے تھے اسی لیے امامتِ آلِ علیؓ کے قائل لوگ جنھیں وہ سبائیہ کہتا ہے، گمراہ اور برسر غلط ہیں۔

ابوالعباس السفاح نے اپنے خطبہ میں قرآن مجید کی تین آیتیں بھی تلاوت کیں اور ان سے اہل بیت کی پاکی، طہارت و براءت پر استدلال کیا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ السفاح کی یہ کوشش قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے کیونکہ پہلی آیت جو سورۃ الاحزاب کی تینتیسویں (۳۳) آیت ہے وہ ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس آیت کو پہلی اور بعد کی آیتوں کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ ان آیات میں ''یانساء النبی'' کہہ کر ان سے بار بار خطاب کیا گیا ہے یہ آیت تطہیر ازدواج مطہرات کی علوِ قدر اور پاکی کے بیان میں ہے۔ دوسری آیت سورۃ الشوریٰ کی تئیسویں (۲۳) آیت ہے، وہ مکی سورہ ہے اور اس میں کفار قریش سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ''اے نبی ان کفار قریش سے کہہ دو کہ میں تبلیغ رسالت کی کوئی اجرت اور مزدوری نہیں مانگتا، مگر رشتہ ناطے کی مودت تو قائم رکھو''۔ اگر اس آیت کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ''اے مسلمانوں میں تم سے اس تبلیغ و رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا مگر اپنے قرابت داروں کی محبت ومودت''۔ تو خاکم بدہن شان رسالت اور مقصد تبلیغ پر اس سے سخت ضرب لگے گی یعنی رسول اکرم علیہ السلام کی بعثت اور رسالت کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ خاندانِ نبوت سے محبت کریں، پھر خاندان نبوت کا آغاز کس نام سے کریں، حضرت ابراہیمؑ کے اسم گرامی سے، عدنان کے نام سے، قریش کے نام سے، قصی کے نام سے، عبدمناف کے نام سے، ہاشم کے نام سے، عبدالمطلب کے نام سے یا عبداللہ کے نام سے وغیرہ وغیرہ؟ اس طرح سے اہل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام پر ابولہب کی محبت بھی فرض ہوگی کہ وہ آنحضرت ﷺ کا چچا اور قربت دار تھا، ابولہب کے دو بیٹے عتبہ وعتیبہ بھی واجب المودت قرار پائیں گے حالانکہ ان بدبختوں نے رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی دو صاحب زادیوں کو طلاق دیدیا تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت السفاح کے جدامجد جناب عباس تو مسلمان بھی نہ ہوئے تھے۔ تیسری قرآنی آیت جو السفاح نے اقرباء نبیؐ کے امتیاز کے لیے پڑھی تھی وہ سورۂ الشعراء کی ایک سو چودہوں (۱۱۴) آیت ہے جس میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکیم دیا گیا ہے کہ ''آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور انھیں اسلام کی دعوت دیں۔'' یہ سورہ بھی مکی سورتوں میں ہے اور ابتدائی سورتوں میں شمار ہوتی ہے اس کا ذکر سیرت وحدیث کی بیشتر کتابوں میں ملتا ہے، چنانچہ آپؐ نے تمام بنوعبد مناف کو جن میں بنوامیہ بھی شامل ہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور انھیں اسلام کا پیغام دیا، ابولہب نے اس مجلس کو درہم برہم کردیا اور سب لوگ جن میں السفاح کے جدامجد عباسؓ بھی تھے، اٹھ کر چلے گئے۔ اس آیت قرآنی سے اگر کوئی بات واضح ہوتی ہے تو یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر عباسیوں کے مورث اعلیٰ بلکہ حضرت علیؓ کے سوا کہ وہ بھی کم عمر لڑکے تھے، بنوہاشم کے کسی شخص نے اسلام کی آواز پر لبیک نہ کہا۔ یہ بات مناقب کے بجائے مثالب کے زیل میں آتی ہے۔[۱۸]

جب عباسیوں اور علویوں میں اقتدار حکومت کی کش مکش شروع ہوئی، تو عباسی خلفاء نے بڑی پرکاری سے اپنے پہلے موقف سے ہٹ کر ایک دوسرا موقف اختیار کیا۔ دوسرا عباسی امام وخلیفہ ابوجعفر المنصور باللہ (۱۵۸۔۱۳۶) اس نئی حکمت عملی کا واضع ہے۔ محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب ذوالنفس الزکیہ نے جب ۱۴۵ھ میں مدینہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا، تو المنصور نے جہاں اس کے تدارک کے لیے عسکری تیاریاں کیں، وہیں سیاسی حربے بھی استعمال کیے۔ فریقین کے درمیان جو خطوط کے تبادلے ہوئے، ان میں المنصور نے اپنے پیش رو السفاح کی روش سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا، وہ اہل تشیع کے مسلک سے مختلف تھا۔ ان مکتوبات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عباسی اپنے سابق موقف سے ہٹ رہے ہیں۔ اب ان کے نزدیک رسول اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ کے درمیانی عرصہ میں امام وخلیفہ کے منصب پر فائز ہونے والے تین اصحاب یعنی سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنیؓ غاصب ومتغلب نہ تھے، بلکہ ان کے تعامل کو حجت قرار دے کر اپنے مخالف (ذوالنفس الزکیہ) کے خلاف دلیل قائم کی گئی تھی۔ یوں دعوت عباسیہ کی شیعی اساس کو نظر انداز کر کے اہل سنت و جماعت کی جانب اس کا جھکاؤ شروع ہوا۔ المنصور نے ذوالنفس الزکیہ کے مکتوب کے جواب میں جو خط تحریر کیا، اس کے بعض فقروں پر غور کرنا چاہیے:۔

''جب حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو آپؐ کے چار چچا بقید حیات تھے۔ ان میں سے دو (حمزہ وعباس) نے آپؐ کی دعوت کو قبول کیا اور اسلام لائے اور دو (ابوطالب وابولہب) نے اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ دو اسلام لانے والوں میں ایک میرے جدامجد تھے (یعنی عباس) اور دو اسلام نہ لانے والوں میں ایک تمھارے جد تھے (یعنی ابوطالب)۔ سو ان اسلام نہ لانے والے چچاؤں کا رسول اکرمؐ سے تعلق ختم ہو گیا اور وہ نبیؐ کی میراث کے حق دار نہ رہے۔ رسول اکرم کے وصال کے وقت آپ کے صرف ایک چچا عباس زندہ تھے چنانچہ نبی کی میراث (خلافت) انھیں کے حصہ میں آئی اور ان سے ان کی اولاد کو یہ میراث منتقل ہوئی۔ تمھارے باپ علیؓ نے اس میراث (خلافت) کا دعویٰ کیا مگر مسلمانوں نے ان کی بجائے یہ منصب ابوبکرؓ کو اور ان کے بعد عمرؓ کو تفویض کیا۔ اور علیؓ کو اس سے محروم رکھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے تمھارے باپ کے بجائے عثمان غنیؓ کو خلافت سونپ دی، جب عثمانؓ قتل ہوئے تو ان کے قتل کی تہمت علیؓ پر لگائی گئی۔ طلحہؓ و زبیرؓ نے ان سے جنگ کی اور سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کی بیعت نہ کی اور اپنا دروازہ بند کر لیا۔ تمھیں اپنے باپ علیؓ کے سابق الایمان ہونے پر بڑا ناز ہے مگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی آخری علالت میں ان کو مسلمانوں کی صلوٰۃ کا امام نہیں بنایا بلکہ ان کے بجائے ابوبکرؓ کو یہ خدمت تفویض کی۔ اگر تم لوگوں کا امامت میں کوئی حق بھی تھا تو اس کو تمھارے باپ حسنؓ نے چند سکوں کے عوض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاویہؓ کے ہاتھ بیچ دیا اور اپنے شیعوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر حجاز چلے گئے۔ پھر تمھارے چچا حسینؓ نے ابن مرجانہ (عبیداللہ بن زیاد، والئ کوفہ) کے خلاف خروج کیا، لوگوں نے ان کا ساتھ نہ دیا وہ مارے گئے اور ان کا سر نیزے پر علم کر کے اس کے سامنے کوفہ لایا گیا۔ اس کے بعد تم نے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا (زید بن علی بن حسین کے خروج کی جانب اشارہ ہے) کہ انھوں نے تمھیں قتل کیا سولی پر لٹکایا اور جلا دیا (اشارہ ہے یحییٰ بن زید کے قتل کی طرف))''[۱۹]

المنصور کے اس خط اور آل حسنؓ پر اس کے مظالم کے ساتھ ہی علویوں اور عباسیوں کے راستے الگ ہو گئے اور سیاسی مصلحتوں کے تحت عباسی خلفاء نے اہل سنت کی جنبہ داری شروع کی۔ المہدی (۶۹۔۱۵۸ھ) سے اس نئی حکمت عملی کا آغاز کیا۔ الہارون (۹۳۔۱۷۰ھ) کے دور میں علویوں کی تعذیب اور حکومت کی ''سنیت'' میں تشدد پیدا ہوا۔ المامون (۲۱۸۔۱۹۸ھ) نے اس حکمت عملی سے انحراف کیا، شیعوں کے امام علی الرضاء کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور عباسی ''شعار'' کو جو سیاہ تھا علویوں کے سبز شعار سے بدل دیا مگر اس کے اس اقدام کی بغداد میں سخت مخالفت ہوئی اور مامون کو معزول کر کے اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ چن لیا گیا۔ مامون نے اپنی روش کو ترک کر دیا تب جا کر بغداد پر اس کا اقتدار قائم ہو سکا۔ شیعہ مخالف اقدام المتوکل (۴۷۔۲۳۲ھ) کے دور میں بہت شدید ہو گیا، اسے ''حامی السنّت'' کا لقب دیا گیا۔ المتوکل نے حضرت حسینؓ کے مزار کو زمین دوز کروا دیا، ارد گرد کی عمارتوں کو منہدم کروا دیا اور اس میں باقاعدہ کاشت کاری کا سلسلہ شروع کرا دیا۔ اس کے بعد جب تشیع و تسنن میں محاذ آرائی شروع ہوئی وہ خلافت عباسیہ کے انقراض تک کبھی شدت سے اور کبھی سست روی سے جاری رہی[۲۰]

اسلامی علوم و فنون کی ضابطہ بندی، تدوین و تالیف کا باقاعدہ آغاز خلفاء عباسیہ کے عہد سے ہوا۔ المنصور کی سرپرستی میں یہ سلسلہ شروع ہوا اور پانچویں صدی ہجری تک یہ عمل زور و شور سے جاری و ساری رہا۔ کچھ درباری فضلاء نے حکومت وقت کی ایماء پر بنو عباس کی تقدس، تعظیم و تکریم سے متعلق احادیث و اقوال مناقبانہ وضع کیے۔ بعض نے سیرت و مغازی پر لکھے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جناب عباسؓ کے مناقب میں واقعات گھڑے، انھیں قدیم الاسلام قرار دیا اور اگر وہ کبھی مسلمانوں کے خلاف قریش کے جھتے میں آئے تو انھیں کفار کے جبر پر محمول کیا۔ جناب عباسؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ''حبر امت'' کا لقب دیا گیا۔ احادیث، احکام، مغازی، تفہیم قرآن اور عربی زبان وادب میں انھیں ''صغار صحابہؓ'' میں سب سے نمایاں ٹھہرایا گیا۔ ان کے تدبر واصابت رائے کے اثبات کی غرض سے سیدنا عمر فاروقؓ کو ان کے مشوروں پر عمل پیرا بتایا گیا۔ تاریخ میں جناب عباس اور جناب عبداللہ بن عباس کے ''ناکردہ'' کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ احادیث میں ان کی عظمت کی روایتیں ایزاد کی گئیں اور ''بنوعباس'' کو اہل بیت رسولؐ، ذالقربیٰ وآل محمدؐ ثابت کیا گیا۔ ان کے اقتدار کو مذہب کا حصار مہیا کیا گیا۔ انھیں وارث ونائب رسول کہا گیا اور ان کی اطاعت کو اللہ اور اس کے مقدس نبیؐ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ احکام ومسائل پر لکھنے والے علماء نے ان سے عمل کو محبت اور ان کے تعامل کو وجہ دین بنا دیا۔ ۲۴۷ھ (۸۶۱ء) کے بعد عباسیوں کے رقبۂ خلافت میں قطع وبرید شروع ہوگئی، مقامی امراء اور بعض طالع آزماؤں نے اسے ''لوٹ کا مال'' سمجھ کر اس پر دست درازی شروع کردی۔ فقہاء مفکرین نے ان کے اقتدار کو جو بالفعل تھا، ناجائز ٹھہرایا اور انھیں الامیر بالاستیلاء اور متغلب خیال کیا، ان کے حیطۂ اقتدار میں اعمال دین کی ادائیگی مثلاً قیام جمعہ وعیدین کو نامشروع کہا اور عدالتی فیصلوں اور زندگی کے روزمرہ کے وظائف کو غیر اسلامی قرار دیا اور ان متبدین کے لیے یہ لازمی قرار دیا، کہ وہ خلفاء عباسیہ سے اپنی حکومتوں کے جواز کی سند میں جمعہ وعیدین کے خطبوں میں ان کا امام وخلیفہ کی حیثیت سے نام لیں، سکوں پر ان کے نام نقش کرائیں اور حکام وقضاۃ کے تقرر کی ان سے منظوری حاصل کریں۔ اس صورت میں انھیں امیر بالاستکفاء (جائز حکمراں) سمجھا جائے گا اور وہ خلیفہ عباسی کے نیابت میں امور سلطنت سرانجام دیں گے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ امراء جن علاقوں پر قابض ومتصرف تھے، وہ امور سابق میں خلفائے عباسیہ کے قبضے میں تھے اور اگر ان میں کوئی نیا علاقہ شامل کیا گیا تھا، تو وہ بھی عباسیوں کی واضح ہدایت کے بعد فتح ہوا تھا۔ کوئی ایسا خطہ جس پر عباسیوں کا کبھی قبضہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ رہا تھا، اس میں شامل نہ تھا[۲۱]

امام عبدالقاہر بغدادی نے ''اصول الدین'' میں قاضی ابوالحسن علی الماوردی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں اور قاضی ابویعلیٰ الفراء نے اسی نام کی اپنی تالیف میں ''امامت'' (خلافت) کو امتِ محمدیہ کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے اور اسے قائم کرنا احکام شرعیہ کے نفاذ کی غرض سے امت پر فرض کفایہ ہے۔ علامہ ابن خلدون نے خلافت (امامت) کی تعریف یوں کی ہے کہ ''وہ معاملات دین کی بجا آوری اور دین کے اصول کے مطابق دنیا کی سیاست کے نفاذ میں صاحب شریعت (ﷺ) کی نیابت اور جانشینی ہے۔ یوں امت کے لیے ضروری ہے کہ منصب امامت کو قائم کرے اور ایک امام وخلیفہ کی بیعت کرے تاکہ امور دین منضبط ہوں، احکام شرعیہ بجالائے جائیں اور دینوی امور ومعاملات کو دین کے مقررہ اصول وضوابط کے تحت سرانجام دیا جائے[۲۲] یہی وجہ تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد صحابہ کرامؓ نے نصب امام کی کوشش کی اور اجماع سے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امام اور رسول مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خلیفہ مقرر کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے نصب امام کا اہتمام کیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کہ اسلامی دنیا، اضطراب کا شکار تھی اس نے جلد سے جلد سیدنا علی مرتضیٰؓ کو کثرت رائے سے اپنا امام اور خلیفہ منتخب کیا۔ خلفاء راشدون کے بعد عہد اموی میں ایک خلیفہ کی زندگی میں اس کے جانشین (ولی عہد) کی نامزدگی اس لیے بھی ضروری ٹھہرائی گئی تاکہ امت کسی انتشار کا شکار نہ ہو۔ اسلامی فکر پر لکھنے والوں نے اسی لیے ''عہد'' (ولی عہد) کو جائز قرار دیا۔ اس طور سے وصال نبویؐ کے بعد سے خلافت عباسیہ کے انقراض تک امت نے اس منصب کو باقی رکھا اور تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانوں میں جبکہ خلافت عباسی برائے نام رہ گئی تھی۔ منصبِ خلافت کو قائم رکھ کر ضروریات دین کی تکمیل اور اس ''فرض کفایہ'' کی تعمیل کی گئی۔ عہد عباسی کے زوال وانحطاط کے وقت بھی بے اختیار اور بے طاقت خلفاء ہی کو تمام دینی اور دینوی معاملات کا مختار ومجاز سمجھا گیا اور طاقت ور ہمہ مقتدر سلاطین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو پابند کیا گیا کہ وہ عباسی خلفاء سے سند حکومت حاصل کریں، ان کے نام کا خطبہ پڑھیں اور سکوں پر ان کے نام نقش کرائیں۔ سلطان محمود غزنوی جیسے فاتح، منتظم اور کشور آرا نے بھی اسی عباسی خلیفہ (القادر) سے سند حکومت حاصل کی اور یمین الدولہ وامین الملت کے خطابات پائے کہ اس کے بغیر عوام وخواص میں اس کی کوئی آئینی حیثیت نہ ہوتی۔ عظیم طغرل سلجوقی نے عباسی خلیفہ (القائم) سے سند حکومت اور رکن الدولہ ورکن الدین کے خطابات پائے اور مفتخر ہوا۔ اس طرح ہر بااقتدار سلطان عباسی خلیفہ سے سند حکومت لینے پر مجبور تھا اور اگر کسی نے عباسیوں سے یہ سند نہ لی تو اس کی حکومت بے اعتبار سمجھی جاتی تھی۔ اس کی مثال علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ (۶۱۸۔۵۹۶ھ/۱۲۲۰ء۔۱۱۹۹) کی حکومت ہے۔ اس نے عباسی خلیفہ الناصر الدین اللہ (۶۲۲۔۵۷۵ھ/۱۲۲۵۔۱۱۷۹ء) کی مخالفت کی، اس پر فوج کشی کی مگر اس کی جمعیت پراگندہ اور اس کی سلطنت تہس نہس ہوگئی۔ عباسیوں کو جو نمایاں مقام حاصل تھا اس کا عشرہ عشیر بھی انھیں کے دور میں قائم ہونے والی مصر وافریقہ کی خلافت فاطمین (۵۶۷۔۲۹۷ھ/۱۱۷۱۔۹۰۹ء) اور اسپین کی خلافت امویہ (۴۲۲۔۳۰۰ھ/۱۰۳۱۔۹۱۲ء) کو نہ مل سکا اور ان کی خلافتوں کی حیثیت مقامی سلطنتوں سے زیادہ نہ سمجھی گئی[۲۳]

خلافت عباسیہ بغداد کی یہی مذہبی حیثیت تھی اور راست کے عوام وخواص میں اس کی یہی اہمیت تھی جس نے منگول سردار ہولاکو کے ہاتھوں آخری عباسی خلیفہ امیر المومنین المستعصم باللہ (۵۶۔۶۴۰ھ/۵۸۔۱۲۴۲ء) کی شہادت، خلافت کے سقوط اور مسلمانوں کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد بھی، ان کے اثر ورسوخ کو ختم نہ ہونے دیا۔ چنانچہ سلطنت دہلی میں غیاث الدین بلبن (۸۶۔۶۶۴ھ/۸۷۔۱۲۶۶ء) کے عہد تک اسی مظلوم عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا[۲۴] بہر کیف خلافت عباسیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مصر وشام کے مملوک سلاطین نے پہل کی اور ۶۵۹ھ (۱۲۶۲ء) میں اس خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم احمد کو مصر وشام کے مملوک سلطان الملک الظاہر بندقداری (۷۶۔۶۵۸ھ/۷۷۔۱۲۶۰ء) نے مسند خلافت پر متمکن کر کے مصر میں خلافت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عباسیہ قائم کردی۔ مصر وشام کے یہ عباسی خلفاء محض متبرک خلیفہ وامام تھے، ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہ تھی۔ یہ برائے نام خلفاء ممالیک مصر وشام کے دست آموز اور اسیر سے زیادہ نہ تھے۔ ان خلفاء کے تقرر کا زمانہ ۹۲۱-۶۵۹ھ (۱۵۱۷-۱۲۶۱ء) تک ڈھائی سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس طویل مدت میں سترہ (۱۷) افراد بساط سیاست پر محض سایہ کی طرح نمودار ہوئے، افلاس، ضعف اور ذلت کے مارے ہوئے ان برائے نام خلفاء کا آخری فرد محمد المتوکل علی اللہ ثالث (۲۳-۹۲۰ھ/۱۷-۱۵۱۴ء) مصر وشام کے فاتح عثمانی ترک سلطان سلیم اول (۲۶-۹۱۸ھ/۲۰-۱۵۱۲ء) کے ہاتھوں اسیر ہو کر استنبول گیا اور وہیں گم نامی کی موت مر گیا [۲۵]

مصر کے یہ عباسی خلفاء، بغداد کے عباسی خلفاء کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھے۔ سلاطینِ مملوک ان سے بوقت ضرورت سیاسی فائدے حاصل کرتے تھے، ان کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان حکمران نے انھیں بالکل درخور اعتناء نہ سمجھا اور ان سے سند حکومت، خلعت تشریف اور لوائے حاکمیت حاصل کرنے کی کوئی زحمت گوارا نہ کی۔ یہ سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق شاہ کی اپچ تھی جس کی بدولت انھیں برعظیم پاک وہند میں یک گونہ اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے جانشین فیروز شاہ نے عباسی خلیفہ المعتضد باللہ سے سند حکومت اور سید السلاطین کا خطاب اور بہمنی سلطان محمد اول (۷۶-۷۵۹ھ/۷۵-۱۳۵۹ء) نے اس سے سند حاصل کی۔ خیر اتنا تو ضرور ہوا کہ ان مسلوب الاختیار خلفاء کی کچھ مالی مدد ہو گئی اور ان کی فاقہ شکنی کی سبیل نظر آئی، کیونکہ ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ''سیدہ زینب'' کے مزار کی مجاوری اور وہاں جلائی جانے والی شمع کی آمدنی تھی، جسے ہم برصغیر کی اصطلاح میں ''چراغی'' کہتے ہیں [۲۶] ان مصری عباسی خلفاء کی زبوں حالی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، مالی بدحالی کا وہ شکار تھے اسیری، نظر بندی اور معزولی عام تھی، ممالک مصر جب چاہتے انھیں معزول یا نظر بند کر دیتے تھے۔ مثلاً الحاکم بامر اللہ کامل ستائیس (۲۷) سالوں تک نظر بند رہا۔ بعض کئی کئی مرتبہ خلیفہ بنائے گئے اور پھر معزول کئے گئے مثلاً المتوکل علی اللہ دو مرتبہ معزول ہوا۔ بحیثیت مجموعی ان خلفاء کو اتنی بھی آزادی نہ تھی کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیاث الدین محمد عباسی کی طرح کسی مملوک سلطان کو ڈانٹ پلاسکیں اور اس سے محمد بن تغلق کی طرح قدم بوسی کرواسکیں۔ ان میں سے بعض اتنے مفلوک الحال تھے کہ انھیں اور ان کے متوسلین کو دو وقت کی روٹی بھی اطمینان سے نہ مل سکتی تھی اور جب اس خاندان کے آخری خلیفہ کو سلطان سلیم اول گرفتار کر کے استنبول لے گیا اور اسے رسوا و خوار کر کے نظر بند کر دیا تو ساٹھ (۶۰) درم یومیہ اس کا وظیفہ مقرر کیا یہ رقم اس زمانے کے لحاظ سے حد درجہ قلیل تھی اور خلیفہ المتوکل علی اللہ ثالث کے وسیع کنبے کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرہ کی بمصداق تھی۔ ہمیں اس میں بھی تامل ہے کہ ان خلفاء کو سلاطین تغلق یا سلاطین بہمنی کی جانب سے جو تحائف وغیرہ بھیجے جاتے تھے، وہ یہ سفرا خود ہضم کر جاتے ہوں گے اور اگر خوف خدا سے انھیں کچھ دے بھی دیتے ہوں گے تو ممالک مصر یا ان کے کارندے جو ان خلفاء کے نگراں تھے، اسے خرد برد کر جاتے ہوں گے۔ یوں یہ بیچارے صرف ''خطبہ'' پر ٹرخا دیئے جاتے تھے [۲۷]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محمد بن تغلق ان مصری عباسی خلفاء کی سیاسی حیثیت سے ناواقف تھا؛ کیا وہ عہد عباسی کے مفکرین کے افکار و خیالات سے اس درجہ متاثر تھا کہ نہ صرف عہد زوال کے برائے نام خلفاء کو مرجع عقیدت اور منبع اقتدار سمجھتا تھا، بلکہ سقوطِ بغداد کے بعد مصر میں قائم ہوتی نام نہاد خلافت کو بھی حاکم و مقتدر بالقوۃ خیال کرتا تھا، کیا وہ مصر و شام کے مملوک سلاطین کی سیاسی بازی گری سے لاعلم تھا اور یہ نہ سمجھتا تھا کہ مصر کی یہ نام نہاد خلافت ایک سیاسی شعبدہ گری اور ڈھکوسلے کے سوا کچھ نہیں ہے؟ اور کیا اسے اس حقیقت سے آگہی نہ تھی کہ عراق وایران کے حکمراں ''ایل خانی'' اور ماوراء النہر کے ''چغتائی'' سلاطین، نہ ان ممالیک مصر و شام کو درخور اعتناء سمجھتے تھے اور نہ ان کے دست آموز بے دست و پا مصری خلفاء کو کوئی اہمیت دیتے تھے؟ یہ مصری عباسی خلفاء کی بدقسمتی تھی کہ وہ بنفس نفیس دہلی نہ آئے ورنہ ان کی پذیرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے، سلطنت دہلی ان کی نذر کر دی جاتی اور سلطان دہلی محمد بن تغلق شاہ خدا جانے کس حد تک گر کر ان کی تکریم و تعظیم بجالاتا! ہمارے اس قیاس کو اس سلطانی عمل سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقویت پہنچتی ہے جو اس نے بغداد کے فلاکت زدہ اور سمرقند کے زوّار غیاث الدین محمد عباسی کے ساتھ روا رکھا۔ دہلی کے چار شہروں میں سے ایک شہر سیدی پورا کا پورا اسے بخش دیا، تمام مشرقی علاقے اسے جاگیر میں دیدیئے سو دیہات رواں اخراجات کے لیے عطا کئے اور بے حساب زر و جواہر اس کے نذر کئے۔ اس پر مستزاد کہ زمین بوس ہو کر اس کی کورنش بجالایا، اپنا سر زمین پر رکھ کر اپنی گردن پر اس کا پاؤں رکھوایا۔ بقول ابن بطوطہ اس طرح کی حرکت کسی بادشاہ سے نہ سنی گئی اور نہ دیکھی گئی اور بقول سر ولزلی ہیگ اس تعظیم اور تقدیس غلو آمیز کو عقل و فہم سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ غیاث الدین محمد عباسی بڑا خوش قسمت تھا کہ سلطان الہند نے اسے بے انتہا انعام و اکرام سے سرفراز فرمایا، ورنہ مصر، شام، عرب، عراق، ایران، خراسان، و ماورالنہر بلکہ خود برعظیم میں لاکھوں عباسی موجود تھے اور ان میں اکثریت ضرورت مندوں کی تھی، لیکن وہ نوازش سلطانی سے محروم اور لذائذ دینی سے بے بہرہ ہی رہے۔ سچ ہے کہ ''ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟'' [۲۸]

سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ کی اس مبالغہ آمیز ''پذیرائی'' کی مورخین نے بعض توجیہات کی ہیں، مثلاً یہ کہ سلطان ''پدر کش'' تھا ملک کے عوام و خواص اس کی حکومت کو ناجائز اور اسے متغلب اور غاصب سمجھتے تھے۔ اس عوامی ناپسندیدگی اور سلطنت کی غیر قانونی حیثیت کے باعث اسے وہ وقار و احترام حاصل نہ تھا جو اس کے پیشرو سلاطین کو حاصل رہا تھا، چنانچہ سلطان اپنی حکومت کو قانونی شکل دینے کی غرض سے مصر کے عباسی خلفاء سے رجوع ہوا۔ مصری خلفاء سے پروانہ حکومت، سند اقتدار اور لوائے حاکمیت کے حصول کی بناء پر اس کی حکومت کو سند جواز مل جاتی اور عوام و خواص میں اس کی بری شہرت اس کے لیے ندامت کا باعث نہ بنتی۔ اس لیے سلطان کی عباسیوں سے غیر معمولی دلچسپی اور عقیدت، محض ذاتی وجوہ کی بناء پر تھی۔ اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہ تھا، یہ محض ایک سیاسی عمل تھا جو سلطان نے اپنے کرتوت پر پردہ ڈالنے اور بدنامی کو نیک نامی میں تبدیل کرنے کے لیے کیا۔ جہاں تک سلطان محمد بن تغلق کے ''پدر کش'' ہونے کی بات ہے وہ محض بات ہی بات ہے، نہ معاصر کتب تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور نہ سلطان کے

© rasailojaraid.com